# قرآنِ حکیم اور عروج و زوالِ اُمم

جناب میر محمد حسین صاحب ایم اے، فاضل دیوبند

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ
بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتّٰىٓ إِذَآ أَخَذَتِ
الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ
أَتٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ
بِالْأَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (یونس-۲۴)

"دنیوی زندگی کی وہی مثال ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی اُتارا۔ پھر اس سے ملا جلا سبزۂ زمین نکلا جسے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین نے اس سے رونق پکڑی اور سج گئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ ان کے ہاتھ لگنے والی ہے۔ ناگاہ رات یا دن کو اس کے متعلق ہمارا فیصلہ آن پہنچا تو ہم نے اُسے کٹا ہوا ڈھیر بنا دیا، گویا کل کو یہاں کچھ نہ تھا۔ غور و فکر کرنے والوں کے لیے ہم نشانیوں کو اسی طرح کھول کھول کر بیان کرتے ہیں"۔

قرآن مجید کی اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ ظہور، کمال اور زوال فطرت کا وہ اُصول ہے جو کائنات کی ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ پودا زمین سے پھوٹتا، پروان چڑھتا، درخت بن کر پھلتا پھولتا اور پورے جوبن پر آ کر مقررہ مدت کے لیے زمین کا زیور بنا رہتا ہے،

مگر آخر کار اس کی جڑیں سوکھنے اور شاخیں مرجھانے لگتی ہیں تا آنکہ وہ ٹنڈ منڈ ہو کر پیوندِ زمین ہو جاتا ہے۔

کائنات کی ہر دوسری چیز کی طرح خود انسان کی انفرادی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ایک ناتواں بچے کی صورت میں جنم لیتا، بتدریج پروان چڑھتا اور عالمِ شباب کو پہنچتا ہے اور آخر کار بڑھاپے میں اضمحلالِ قویٰ کا شکار ہو کر موت کے سیاہ دبیز پردوں کے پیچھے ہمیشہ کے لیے رُوپوش ہو جاتا ہے۔ اس کی اجتماعی زندگی میں بھی یہی اُصول کارفرما ہے۔ قومیں صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتی ہیں۔ جدوجہد سے غلبہ و اقتدار حاصل کرتی ہیں اور آخر میں زوال کا شکار ہو کر نکبت و ادبار کی ظلمتوں میں اس طرح گم ہو جاتی ہیں کہ صرف تاریخ میں ان کا نام رہ جاتا ہے۔

فطرت کا یہ اُصول اس قدر ہمہ گیر ہے کہ دُنیا کی کوئی قوم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ - کہ ہر اُمت کے لیے ایک مدت مقرر ہے چنانچہ جب وہ مدت پوری ہونے کو آتی ہے تو نہ وہ اُمت ایک گھڑی کی تاخیر کر سکتی ہے اور نہ جلدی۔

ظہور و زوال کا یہ درمیانی وقفہ کتنے عرصہ کا ہوتا ہے، فلسفۂ اجتماع کے ماہرین نے اس کی مدت اپنے اپنے مشاہدے اور مطالعے کے مطابق مختلف بتائی ہے۔ کوئی اسے فرد کی زندگی سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کی عمر، انسان کی زیادہ سے زیادہ ممکن عمر کے برابر یعنی ایک سو بیس کے قریب بتاتا ہے۔ اور کسی کی رائے میں پانچ صدیاں گزرنے کے بعد ہر قوم زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ کسی قوم کی نسلی خصوصیات، اس کی عادات و مزاج، اس کے مذہبی معتقدات و اعمال، اس کی تاریخی روایات، آب و ہوا، محلِ وقوع، معاشی و تمدنی نظام، غرض بہت سے ایسے عوامل ہیں جو اس کی صلابت و جلاوت یا اس کے ضعف و اضمحلال

پر اثر انداز نہ ہوتے ہیں۔ ایک مضبوط اور صحت مند جسم بیماریوں کا زیادہ دیر تک مقابلہ کر سکتا ہے اور زیادہ عرصہ تک جی سکتا ہے جب کہ ایک پیدائشی طور پر لاغر و ناتواں انسان، آسانی سے جسمانی عوارض کا شکار ہو کر بہت جلد موت کے گھاٹ اتر سکتا ہے۔

اِسی طرح وہ قوم جو جفاکش، شدائد و مشکلات کا تحمل کرنے والی ہو، جس کے اسلاف نے تاریخ میں غیرت و شجاعت اور ایثار و قربانی کے غیر معمولی یادگار کارنامے چھوڑے ہوں، جنہوں نے اس قوم کے اندر عزت سے جینے یا کٹ مرنے کا جذبہ ہمیشہ زندہ رکھا ہو، جو صحراؤں یا کوہستانوں کی سخت کوشی زندگی کی خوگر ہو اور جس کا مذہب اسے پاکیزہ خیالات رکھنے اور پاکیزہ اعمال کی تلقین کرتا ہو۔ اس قوم کے مقابلہ میں زیادہ دیر پا ثابت ہوتی ہے جس کے سامنے عزت سے جینے کی کوئی مثال اس کے اسلاف نے نہ چھوڑی ہو، یا تعیش و تنعم کی زندگی کی خوگر ہو جائے اور جسے خبائث اعمال سے روکنے والا اس کا اپنا کوئی اجتماعی ضمیر بھی نہ ہو، غالباً اسی لیے قرآن مجید نے یہ بات تو بار بار دہرائی ہے کہ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ کہ ہر قوم کے لیے ایک مدت مقرر ہے۔ لیکن اس مدت کا تعین کہیں نہیں کیا۔

البتہ بنی اسرائیل کے زوال اور اُمتِ مسلمہ کے کمال و عروج کی داستان ہمارے سامنے بڑی تفصیل سے رکھی ہے جس کے مطالعہ سے ہم عروج و زوالِ اُمم کے قرآنی اُصولوں کو ضرور معلوم کر سکتے ہیں۔ بے شک دوسری بہت سی قوموں کے زوال کو بھی قرآن مجید میں بار بار دہرایا گیا ہے تاہم اس میں اس تفصیل سے کام نہیں لیا گیا جس سے بنی اسرائیل کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ قرآن مجید کوئی عمرانیات کی کتاب نہیں، اس لیے اس میں ان اُصولوں کو اس طرح گن گن کر تو بیان نہیں کیا گیا، جس طرح اس موضوع کی کسی درسی کتاب میں بیان کیا جاتا ہے۔ البتہ اُمتِ مسلمہ کے احوال و احکام کو جس تفصیل، تذکرہ، تاکید، تمثیل، اوّلیت اور اعادہ و تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان اُمور کو کسی قوم کے غلبہ و تمکن فی الارض میں گہرا دخل ہے اور ان کا فقدان اس کے زوال و انحطاط

کا موجب بن سکتا ہے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کے مطالعے سے جو چیز سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے، وہ کسی قوم کا اتحاد و اتفاق ہے۔ ظاہر ہے جب تک کسی قوم کے تمام افراد باہم متحد نہیں ہوتے اور کوئی مضبوط رشتۂ وحدت انہیں باہم دگر وابستہ و پیوستہ نہیں کر دیتا، اس وقت تک اُسے وہ قوت و طاقت میسر نہیں آسکتی جس سے کام لے کر وہ دنیا والوں سے اپنا لوہا منوا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مسلمانوں کے باہمی اتحاد و یگانگت کو نعمتِ عظمیٰ قرار دیا ہے۔ اسے قائم رکھنے کی تاکید کی ہے اور انتشار و افتراق کے ہولناک نتائج پر متنبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور تم کمزور پڑ جاؤ گے۔ چنانچہ آل عمران میں انہیں تاکید کی کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ..... اور سورۂ انفال میں انتباہ کیا کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ .....

دنیا میں غلبہ و تمکن کے حصول کی اس خشتِ اوّل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے قبائل کو باہم شیر و شکر کر دینا آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اللہ کا بہت بڑا افضل سمجھیے کہ اس نے نفرت و عصبیت کی دیواروں کو توڑ کر انہیں ایک دوسرے کا بھائی بھائی بنا دیا۔ ان عربوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ بے شمار ایسے قبائل میں بٹے ہوئے تھے، جو ہمیشہ معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے تھے۔ ان میں قبائلی تفاخر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان کی کوئی قوت نہ تھی۔ وہ ایران و روم کا پانی بھرتے تھے۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ کلمۂ توحید پر اس طرح اخوت و یگانگت کے رشتے میں منسلک ہو گئے کہ ایک دوسرے کی خاطر جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس اتحاد و وحدت نے ان کو وہ قوت دے دی کہ وہ اپنے وقت کی دو سپر طاقتوں کو پامال کر کے انہیں اپنے زیرِ نگیں لے آئے مگر شومیٔ قسمت سے اُمتِ مسلمہ کی یہ وحدت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ سب

سے پہلے ان میں سیاسی اختلاف نے سر اُبھارا ۔ اور جنگ جمل و صفین میں نوّے ہزار کے قریب کلمہ گو اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں کٹ گئے ۔ چند مفروضہ عقائد و نظریات کو لے کر خارجی اُٹھے اور سالوں تک مسلمان حکومتوں سے اُلجھتے اور ضعف و زوال کا باعث بنتے رہے ۔ مصر و یمن کے قبائل میں نسلی تعصب کی آگ اس بُری طرح بھڑکی کہ اُمتِ مُسلمہ کے رُعب و دبدبہ کو جھلسا کر رکھ دیا ۔ پھر اہل سنّت و شیعانِ علی کے مذہبی و سیاسی اختلافات نے نہ صرف عباسی اقتدار کو دریائے دجلہ میں غرق کر دیا بلکہ اُمتِ مُسلمہ کے دو طبقوں کو ایک مستقل اور کبھی نہ ختم ہونے والی کشمکش میں مبتلا کر دیا ۔ اور آخر کار جب بیسویں صدی کے اوائل میں عربوں نے نسلی و لسانی عصبیّت کا شکار ہو کر ترکِ خلافت کو جو اُمتِ مُسلمہ کے اتحاد کی ایک کمزور سی علامت رہ گئی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ۔ اور یہ وقت اُمتِ مُسلمہ کے صدیوں پر پھیل جانے والے ادبار و نکبت کا نقطۂ آغاز تھا ۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو کمزور بنانے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے یہی حکمتِ عملی اختیار کی تھی کہ انہیں باہم دست و گریباں گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا ۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا ...... (قصص : ۴)

کسی قوم کی ترقی و عروج کے لیے دوسرا بڑا عامل علم ہے ۔ ہو سکتا ہے ایک وحشی و جاہل قوم اپنی سفاکی و خونریزی کی بدولت چند روز کے لیے برسرِ اقتدار آ جائے مگر اس کے قصرِ اقتدار کی بنیاد اتنی کمزور ہوتی ہے کہ بہت جلد زمین بوس ہو جاتی ہے جب کہ دُنیا میں جتنی قوموں نے دیرپا عروج حاصل کیا، علم ہی کی بدولت کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنی تعلیمات میں حصولِ علم پر بڑا زور دیا ہے ۔ قرآن و سنّت کے صفحات اس کے فضائل سے بھرے پڑے ہیں ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی جو وحی نازل ہوئی اس میں حصولِ علم ہی کی تاکید کی گئی اور سب سے پہلے انسان پر خدا کی نعمتِ علم ہی کو گنوایا گیا ۔ اور اس غیر متناہی میدان میں جولانیوں کے لیے انسان کی غیر محدود استعداد کی طرف اشارے کیے گئے ۔ علم کے لیے اسی غیر محدود استعداد کی بدولت آدمؑ نے فرشتوں پر برتری حاصل کی اور اُسے خلعتِ خلافت سے نوازا گیا ۔ اہلِ علم اور غیر اہلِ علم میں جو بُعد المشرقین پایا

جاتا ہے۔ اس کو یہ کہہ کر واضح کیا کہ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (زمر: ۹) پہلے مسلمانوں کے نزدیک علم کا کیا مقام تھا، اس کا اظہار حضرت معاذ بن جبلؓ کے ایک خطبے سے ہوتا ہے جو آپ نے علم کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ میرے خیال میں علم کے موضوع پر اس پر اضافہ ناممکن ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ فَإِنَّ تَعَلُّمَهٗ لِلّٰهِ خَشْيَةٌ وَطَلَبَهٗ عِبَادَةٌ وَمُذَاكَرَتَهٗ تَسْبِيْحٌ وَالْبَحْثَ عَنْهُ جِهَادٌ وَتَعْلِيْمَهٗ لِمَنْ لَا يَعْلَمُ صَدَقَةٌ وَبَذْلَهٗ لِأَهْلِهٖ قُرْبَةٌ لِأَنَّهٗ مَعَالِمُ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَمَنَارُ سُبُلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَالْأُنْسُ فِي الْوَحْشَةِ وَالصَّاحِبُ فِي الْغُرْبَةِ وَالْمُحَدِّثُ فِي الْخَلْوَةِ وَالدَّلِيْلُ عَلَى السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالسِّلَاحُ عَلَى الْأَعْدَاءِ وَالزَّيْنُ عِنْدَ الْأَخِلَّاءِ۔ يَرْفَعُ اللّٰهُ بِهٖ أَقْوَامًا وَيَجْعَلُهُمْ فِي الْخَيْرِ قَادَةً وَأَئِمَّةً تُقْتَبَسُ آثَارُهُمْ وَيُقْتَدٰى بِفِعَالِهِمْ وَيُنْتَهٰى إِلٰى رَأْيِهِمْ۔ تَرْغَبُ الْمَلَائِكَةُ فِي خُلَّتِهِمْ وَبِأَجْنِحَتِهَا تَمْسَحُهُمْ۔ يَسْتَغْفِرُ لَهُمْ كُلُّ رَطْبٍ وَيَابِسٍ حَتَّى الْحِيْتَانُ فِي الْبَحْرِ وَهَوَامُّهٗ وَسِبَاعُ الْبَرِّ وَأَنْعَامُهٗ لِأَنَّ الْعِلْمَ حَيَاةُ الْقُلُوْبِ مِنَ الْجَهْلِ وَمِصْبَاحُ الْأَبْصَارِ مِنَ الظُّلَمِ۔ يَبْلُغُ الْعَبْدُ بِالْعِلْمِ مَنَازِلَ الْأَخْيَارِ وَالدَّرَجَةَ الْعُلْيَا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَالتَّفَكُّرُ فِيْهِ يَعْدِلُ بِالصِّيَامِ وَمُدَارَسَتُهٗ بِالْقِيَامِ۔ بِهٖ تُوْصَلُ الْأَرْحَامُ وَيُعْرَفُ الْحَلَالُ مِنَ الْحَرَامِ وَهُوَ إِمَامُ الْعَمَلِ وَالْعَمَلُ تَابِعُهٗ وَيُلْهَمُهُ السُّعَدَاءُ وَيُحْرَمُهُ الْأَشْقِيَاءُ۔

(حیاۃ الصحابہ)

یعنی "علم حاصل کرو، کیونکہ اس کا سیکھنا خشیتِ الٰہی، اس کی تلاش عبادت، اس کا تکرار و اعادہ تسبیح، اس کی تحقیق جہاد، ان پڑھوں کو اس کا سکھانا صدقہ، اور اہل لوگوں پر اس کا خرچ کرنا قربِ خداوندی ہے، کیونکہ اس سے حلال و حرام کا

پتہ چلتا ہے اور اس سے اہلِ جنت کی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ یہ پریشانیوں میں مونسِ جان، غریب الوطنی میں ساتھی، تنہائیوں میں ہم سخن، دُکھ سکھ میں راہ نما، دشمنوں کے خلاف ہتھیار اور دوستوں میں زینت ہے۔ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ قوموں کو سربلند کر کے اچھے کاموں میں امام و پیشوا بنا دیتا ہے جن کے نشان ہائے قدم سے لوگ اقتباسِ نور کرتے، ان کے کارناموں کی پیروی کرتے اور ان کی رائے سے استناد کرتے ہیں۔ فرشتے اُن کی دوستی کے خواہاں ہیں اور اپنے پروں سے انہیں چھوتے ہیں۔ دنیا کی ہر رطب و یابس چیز حتیٰ کہ سمندروں میں مچھلیاں اور دوسرے حشرات، خشکی کے درندے اور چوپائے ان کے لیے استغفار کرتے ہیں، کیونکہ علم، جہالت کی وجہ سے مُردہ دلوں کے لیے باعثِ حیات اور تاریکیوں میں آنکھوں کے لیے چراغ ہے۔ اِس کی بدولت انسان نیک لوگوں کے مرتبے تک پہنچتا بلکہ دُنیا و آخرت میں اس سے بھی بلند تر مقام پا لیتا ہے۔ اس میں غور و فکر کرنا روزے اور اس کا پڑھنا پڑھانا نماز کے برابر ہے۔ اس کے ذریعے رشتوں کو جوڑا اور حلال و حرام میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ علم، عمل کا امام اور عمل علم کا تابع ہے۔ یہ سعادت مندوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ بدنصیب اس سے محروم رہتے ہیں۔

اسلام نے علم کی جو جوت مسلمانوں کے سینوں میں جگائی تھی، اس کی روشنی میں انہوں نے نہ صرف دُنیا بھر میں رائج ہر طرح کے دینی و دُنیوی علوم حاصل کیے اور ان میں کمال پیدا کیا، بلکہ ان میں گراں بہا اضافے بھی کیے اور کئی ایک علوم کے موجد و بانی ٹھیرے۔ عظیم الشان لائبریریاں قائم کیں۔ دوسری زبانوں کے علوم کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔ ان کی ہر بستی میں بلامبالغہ سینکڑوں کی تعداد میں مدرسے اور مکتب ہوتے تھے، جہاں بچے اور بچیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ قرطبہ و غرناطہ کی مسلمان یونی ورسٹیاں وہ درس گاہیں تھیں جہاں بیرونی ممالک سے بھی لوگ آکر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انہی یونی ورسٹیوں کے تعلیم یافتہ یہودیوں اور عیسائیوں نے یورپین ممالک میں جا کر بڑی بڑی درس گاہیں قائم کیں۔ جن میں صدیوں تک مسلمان علما کی تصانیف پڑھائی جاتی رہیں۔ مسلمانوں میں پایا جانے والا فروغِ علم کا یہ جذبہ یورپ

میں تحریک احیائے علوم ( RENASCENCE ) کا محرک بنا۔ اِس طرح مسلمانوں کو بجا طور پر یورپ کا معلّم کہا جا سکتا ہے۔ جب تک علم سے مسلمانوں کا یہ شغف قائم رہا، اور اس کی تحصیل کے لیے ان کی محنت و جستجو جاری رہی، وہ دنیا میں سربلند رہے۔ پھر جیسے ہی انہوں نے علم سے مُنہ موڑا، اقتدار و حکومت نے بھی ان سے آنکھیں پھیر لیں، چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ دوسری اقوام سے زیادہ وسائل رکھنے کے باوجود وہ صرف اس لیے بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں کہ ان کے پاس ان وسائل سے استفادہ کے لیے ضروری فن ہے نہ علم۔ (باقی)

---

(بقیہ اسلام میں اختلاف کے آداب)

اختلاف باعثِ رحمت تھا اور جس کی وجہ سے فقہِ اسلامی کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، اور جس کے ذریعے دینِ اسلام کا فطرت و واقعیت کے عین مطابق ہونا اور اس میں لوگوں کی مصلحتوں کا بھرپور لحاظ رکھا جانا ثابت ہو گیا، وہی اختلاف مسلمانوں کے افتراق و انتشار اور باہم دست و گریبان بن جانے کا ایک ذریعہ بن گیا۔ جس نے آگے چل کر ایک ایسے دردناک عذاب کی شکل اختیار کر لی جس نے اُمتِ مُسلمہ کو بے فائدہ اور لایعنی اُمور میں اُلجھا کر اُس کی قوت، وطاقت اور صلاحیتوں کو تباہ و برباد کر دیا۔

---